پروفیسر حمید احمد خان

قائدِ اعظم کی سیرت و کردار

مارچ ۱۹۴۰ء میں ایک صبح لاہور کے ایک کالج میں نوجوان لیکچرار جمع تھے اور اس معجزے پر اپنی حیرت کا اظہار کر رہے تھے جسے گزشتہ شب انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے دیکھا تھا۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ جو بات انھیں ایک دن پہلے تک محض خواب و خیال معلوم ہوتی تھی، وہ اب ایک حقیقت بن کر ان کے دل و دماغ کو روشن کر رہی تھی۔ اس انقلاب کا سبب صرف اتنا تھا کہ رات آلِ انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کے پیرانہ سال مگر جواں ہمت قائد محمد علی جناح نے مسلسل چند گھنٹوں تک ایک معرکتہ آلآرا تقریر کر کے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس برِ صغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں —— ایک ایسی قوم جو اپنا ملک رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ عزم کہ اس ملک میں آزاد ہو کر رہے گی۔ ان لفظوں میں کچھ ایسا اعجاز تھا کہ کل جس بار۔ے میں ہراساں تھے کہ آخر یہ سب کچھ کس طرح ہو گا، آج اسی کے متعلق دل خود بخود گواہی دے رہا تھا کہ یہ ضرور ہو کے رہے گا۔

ہم میں سے وہ لوگ جنھیں ۱۹۴۰ء سے چند برس پہلے کے حالات یاد ہیں، گواہی دیں گے کہ کس طرح بے یقینی اور بے بسی کی وہ کیفیت جس میں ہم سب مبتلا تھے، قراردادِ پاکستان نے یک بیک زندگی کے جوش اور حرارتِ ایمانی میں بدل دی۔ اب ہر بات ممکن نظر آتی تھی۔ اب پاکستان کا وجود ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا۔ یہ ذہنی انقلاب اس لیے پیدا ہوا کہ ہمیں قائدِ اعظم کی ذاتی دیانت اور فراست پر پورا بھروسہ تھا۔ جب انھوں نے کہہ دیا تھا کہ "پاکستان بنے گا" تو ہمیں بھی پورا یقین ہو گیا کہ پاکستان بن کے رہے گا۔

پوری قوم کا یہ بے مثال اتحاد قائدِ اعظم کو ناگہانی طور پر حاصل نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے برسوں کی ریاضت، سالہا سال کی بے لوث خدمت سے یہ مقام حاصل کیا تھا کہ نو کروڑ مسلمان متحد ہو کر ایک مضبوط دیوار کی طرح ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے سے

تقریباً تین برس پہلے علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کو لکھا تھا کہ "آج ہندوستان بھر میں آپ ایک ہی مسلمان ہیں جس سے قوم کو بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ آنے والے طوفان سے ہمیں سلامت گزار لے جائے گا۔" اس ایک جملے میں قائد اعظم کی سیاسی بصیرت، فطری عزم و استقلال، اور بے غرضانہ خدمت قوم کے پہلے تیس اور آخری دس برسوں کا خلاصہ بیان ہو گیا تھا۔ اقبال کی اور ملتِ اسلامیہ کی سب امیدیں اس "ایک ہی مسلمان" نے جس طرح پوری کیں، اس کی کہانی اب تاریخ کے صفحات پر جلی حروف میں لکھی جا چکی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں جب قائد اعظم نے پہلی مرتبہ قومی آزادی کے لیے اپنی چالیس سال کی جدوجہد شروع کی تو ہمارے برصغیر کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ حکومت انگریز وائسرائے کے ہاتھ میں تھی اور حکومت کا کاروبار ایک ایسی کونسل کے مشورے سے طے پاتا تھا جس کے سب ارکان انگریز تھے۔ ہر درجے اور مرتبے کے انگریز عہدہ دار زندگی کے ایک ایک محکمے پر قابض تھے۔ صوبوں کے گورنر، قسمتوں کے کمشنر، ضلعوں کے ڈپٹی کمشنر سب انگریز تھے۔ ریلوے کے بڑے اور چھوٹے افسر، سڑکوں کے، جنگلات کے، نہروں کے با اختیار حاکم، محکمہ صحت کے سب اعلیٰ ڈاکٹر، یہاں تک کہ ضلع کے ہسپتالوں کے ڈاکٹر تک سب انگریز تھے۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور رجسٹرار، صوبائی تعلیمات کے ناظم اور ضلع بہ ضلع گھومنے والے انسپکٹر آف اسکولز سب کے سب انگریز تھے۔ فوج انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ پولیس پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ سب سے اونچی عدالتوں میں انگریز کا حکم چلتا تھا، جو محصول ہم ادا کرتے تھے، انھیں انگریز جمع کرتے تھے اور انگریز ہی خرچ کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں، عدالتوں، یونیورسٹیوں اور مدرسوں کی زبان انگریزی تھی۔ انگریزی اثرات سے بھری ہوئی اس فضا کے پیچھے ہندو نے اپنا پاؤں انگریز کے ہاتھوں میں دے رکھا تھا، جس کے صدقے حکومت کے کاروبار سے باہر تجارت اور صنعت و حرفت پر ہندو کا قبضہ تھا۔ زندگی کے عام کاروبار میں جہاں چھوٹے انگریز عہدہ دار ختم ہوتے تھے وہاں سے چھوٹے ہندو اہل کار شروع ہو جاتے تھے۔ اس طرح برصغیر کے تقریباً ہر شعبے میں مسلمان قوم پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں علامہ اقبال نے فکری طور پر اور قائد اعظم نے عملی طور پر انسانی زندگی کی یہ بنیادی حقیقت

ثابت کر دکھائی:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

مومن کا آپ تقدیرِ الٰہی بننا کس طرح ممکن ہو سکا؟ اس سوال کا جواب قائدِ اعظم کی زندگی کی پوری داستان میں موجود ہے۔

وہ ایک دراز قد انسان ضرور تھے لیکن عمر کی کسی منزل میں بھی نہ کبھی خاص طور پہ تنومند تھے، نہ کسی نمایاں تن و توش کے مالک۔ لیکن ان کی آنکھوں میں بجلی کی ایک چمک تھی جو ان کی روح کے نامحدود خزانوں کا پتا دیتی تھی۔ بیس بائیس برس تک انھوں نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی کہ متحدہ ہندوستان کی عظیم مسلم اقلیت کے حقوق کا آئینی تحفظ کس طرح کیا جائے۔ میثاقِ لکھنؤ، جناح کے چودہ نکات وغیرہ اسی دور کے کارنامے ہیں لیکن یہ دور مجموعی حیثیت سے قائدِ اعظم کی شکست کا دور ہے۔ "شکست" کے لفظ سے ہمیں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ مردِ مومن کی ہر شکست کسی بڑی فتح مندی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس تمام مدت میں جس کا ذکر ابھی ہوا، قائدِ اعظم کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے تدبّر کا ارتقا اس طرح پر ہوتا چلا گیا کہ ظاہرا ناکامی کا یہی دور ان کی آخری فتح مبین کی بنیاد بن گیا۔ ۱۹۳۰ء کے قریب ان کی فراستِ ایمانی نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا، جہاں ان پہ یہ ظاہر ہوا کہ مسلمانوں کے حقوق کا آئینی تحفظ متحدہ ہندوستان میں سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اب انھوں نے ہندی قومیت کے بت کو توڑا اور ۱۹۳۵ء سے بعد کے دس بارہ برس مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت کی تعمیر میں لگا دیے۔

اس زمانے کا ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد آتا ہے۔ ۱۹۴۳ء یا (۱۹۴۴ء) کا ذکر ہے، جب قائدِ اعظم کا سن پینسٹھ برس سے متجاوز تھا کسی نے ان سے بڑے ادب سے پوچھا: قائدِ اعظم دیکھنے میں آپ اس قدر نحیف سے آدمی نظر آتے ہیں کہ یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ آپ اپنی قوم کی خاطر اس قدر مشقت کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ براہِ کرم یہ بتا دیجیے کہ آپ اس حالت میں اتنا کچھ کیونکر کر لیتے ہیں؟ قائدِ اعظم نے تبسم سے جواب دیا: "دو وجہ سے۔ ایک تو اس لیے کہ میں

بہت کم کھاتا ہوں اور دوسرے اس لیے کہ میں اپنے ضمیر کے اندر کسی قسم کا بوجھ نہیں پالتا۔[۱]

یہ ایک مردِ مومن کا دوٹوک جواب تھا۔ لہجے کی یہ قطعیت صرف اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے باطن کا حساب سختی سے لینے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی بصیرت زندگی کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں اس کی رہنمائی کرتی ہو ــــ اس قسم کا ایک موقع میرے مشاہدے میں اس وقت آیا، جب ۱۹۴۷ء میں عیدالاضحیٰ کی تقریب پر دہلی کے مسلمانوں کے بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے ایک عجیب وغریب نکتہ ارشاد فرمایا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پنجاب میں ہزارہا مسلمان مرد، عورتیں اور بچے سفاکی سے قتل کر دیے گئے تھے۔

قائدِ اعظم نے کہا۔ "لوگ مجھ سے بار بار کہتے ہیں کہ ہم صرف آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ پھر دیکھیے کہ کس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ آپ ہمارے جرنیل ہیں ہمیں ایک دفعہ حکم دیجیے کہ ہم آگے بڑھیں"۔ اس کے بعد قائد اعظم نے جو کچھ فرمایا، وہ میرے حافظے پر آج تک نقش ہے۔ کہنے لگے: "میں کس فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دوں؟ کیا ان لوگوں کو جو ابھی تک بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں، جنھیں ابھی تنظیم کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں"؟ اس کے بعد قائد اعظم نے اپنی آواز بلند کی اور فرمایا: "اگر قائدِ اعظم اس حالت میں لوگوں کو آگے بڑھنے کی دعوت دے تو وہ جرنیل نہیں بلکہ مجرم ہوگا"۔[۲]

یہ تھا اس مردِ مجاہد کا اندازِ کار جسے ہم نے بجا طور پر اپنا سب سے بڑا رہنما مانا۔ ۱۹۴۷ کے بعد جب طوفان پھوٹ پڑا تو قائدِ اعظم کی صاحب ضمیر ہستی کہیں باطل کے خس وخاشاک پر بجلی بن کر گری، کہیں ناتوانوں کی حمایت میں ایک آہنی دیوار بن گئی۔ انھوں نے خوف، فریب لالچ، الغرض دشمنوں کی ہر یورش کا مقابلہ کیا۔ زمانے نے دیکھا کہ کروڑوں کے اس برِ صغیر میں صرف ایک انسان اپنی قوتِ ایمانی کے سہارے تن کر سیدھا کھڑا رہا۔ وہ بنیے کے مکر کے جال سے نکلا اور بنیے کی دولت کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگاتا، انگریز کے قہر و جبروت کو تیغ

---

[۱] "I have no skeleton in the cupboard."

[۲] "Qaid-i-Azam will be a criminal and not a General if-

نگاہ سے مسخر کرنا، بالآخر اس پاک سرزمین تک آپہنچا۔ آج ہمارے دل اس کے لیے شکرگزاری کے احساس سے لبریز ہیں۔ اس کا نام اور کام ہم سب کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی امنگ پیدا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

زندہ باد قائدِ اعظم! پائندہ باد پاکستان!

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ذکر کرتے ہوئے بہت سے لوگ اب بھی ان کی شخصیت کے اخلاقی کمال کا صحیح احاطہ نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسا دستور بن گیا ہے کہ لوگ قائدِ اعظم کی سیرت کو کسی نہ کسی ایک خوبی، اور صرف اسی ایک خوبی، سے عبارت قرار دیتے ہیں اور قائدِ اعظم کے کارنامۂ زندگی کو کبھی نری دیانت داری، کبھی نری فراست، یا پھر کبھی نری محنتِ شاقہ یا قسمت کی رسائی، یا نری اولوالعزمی کا کرشمہ سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے انسان کی عظمت اس قسم کی کئی کرامتوں سے ترکیب پاتی ہے، وہ کسی ایک کمال پر منحصر نہیں ہوتی۔ یہ ہماری کوتاہ بینی ہے کہ کسی بڑائی کا صرف ایک پہلو دیکھ کر ہم اسی کو سب کچھ مان لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ قائدِ اعظم نے ہمارے برِصغیر کی تاریخ کے ایک نازک دور میں خدا کی مشیت کا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ فرض بجا لانے کے لیے انھوں نے زندگی کی ہر منزل میں کوئی نہ کوئی ایسا کام سرانجام دیا، جس کے لیے کوئی الگ اخلاقی فضیلت درکار تھی۔ آئیے آج ہم یہ دیکھیں کہ لڑکپن سے پیری تک قائدِ اعظم کی زندگی کس طرح گزری اور ان کے عمل سے مشیتِ ایزدی کے تقاضے کس طرح پورے ہوتے، سب سے پہلے گزشتہ صدی کے دورِ آخر کا ایک منظر لیجیے۔

انیسویں صدی کے ختم ہونے میں ابھی دس گیارہ برس باقی ہیں۔ کراچی شہر (جو آج کل کے شہر کے مقابلے میں ایک بہت ہی چھوٹا سا شہر معلوم ہوتا ہے) دن کے ہنگاموں سے فارغ ہو کر رات کے آغوش میں سو گیا ہے۔ کوچہ و بازار سنسان ہیں۔ آدھی رات کا عمل ہے۔ اس وقت کھارادر کے محلے کی طرف نکل چلیے۔ یہاں ایک سہ منزلہ مکان کی درمیانی منزل میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک کمرے میں تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا جس کی پیشانی روشن ہے اور آنکھوں میں ذہانت کا نور چمکتا ہے۔ لالٹین سامنے رکھے اپنی کتابوں پر جھکا ہوا ہے۔

اس کمرے میں آس پاس گھر کے لوگ بستروں پہ سو رہے ہیں۔ کچھ بڑے ہیں کچھ بچے۔ روشن پیشانی اور چمکتی آنکھوں والا لڑکا اکیلا جاگ رہا ہے، جو لگن اس کے دل میں لگی ہوئی ہے وہ اس میں محو ہے۔ اس کے لیے نہ سستی ہے نہ تھکن، نہ نیند نہ آرام۔ دنیا و ما فیہا سے غافل، وہ اپنا سبق دہرانے میں لگا ہوا ہے، مگر نہیں، وہ دوسروں کی موجودگی سے کچھ ایسا غافل بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی لالٹین کے اردگرد اپنی کاپیاں اور کتابیں اس لیے کھڑی کر رکھی ہیں کہ لالٹین سے نکلنے والی شعاعیں سونے والوں کی آنکھوں پہ نہیں پڑتیں، صرف اس صفحے پہ پڑتی ہیں جو اس کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس طرح دوسروں کے درمیان گھرا ہوا بھی وہ تن تنہا بیٹھا اپنے مطالعے میں مستغرق دکھائی دیتا ہے۔ یہ کسی ایک رات کی بات نہیں۔ ہر شام کھانے کے بعد وہ اپنی کتابیں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی کمرے میں دوسرے لوگ بھی لیٹتے ہیں۔ جب وقت زیادہ ہو جاتا ہے تو پہلے بچے، پھر بڑے ایک ایک کر کے سو جاتے ہیں۔ مگر نو عمر محمد علی اب بھی علم کی روشنی سے لو لگائے اپنی آنکھوں کا نور اپنی کتابوں پہ نچھاور کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی آدھی رات گئے گھر کے بڑوں میں سے کسی کی آنکھ کھل جاتی ہے تو وہ سنسان رات میں اس تنہا جاگنے والے کو سمجھاتا ہے "بس اب سو جاؤ۔ اس طرح جاگ کر بیمار ہو جاؤ گے!"

مگر یہ دار دل طالب علم ایک ہی جواب دیتا ہے:

"اگر آج پڑھنے سے جی چراتا رہا تو کل کس کام کا رہوں گا؟"

اس طرح محمد علی جناح نے زندگی کی تنظیم نو کے لیے تن تنہا کام کرنے کی بنیاد رکھی۔

دس برس گزر چکے ہیں۔ کھارا در کراچی کے سیدھے سادے بالاخانے میں رات کو تنہا جاگنے والا طالب علم اب بمبئی میں ایک ہونہار بیرسٹر ہے۔ اس دوران میں اس کی روح نے اپنی تعمیر کی طرف سفر کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اب اس کی کاوشوں نے سینۂ کوہسار کو چیر کر جوئے شیر لانا سیکھ لیا ہے۔ اب اس کے ضمیر نے نہیں کا لفظ کہنے کی جرأت پیدا کر لی ہے ۔۔۔ وہ نہیں جو زمانے کی رو کو پلٹ دیتے ہیں ۔۔۔ جاہ و غرور کی دنیا کو زیر و زبر کرنے میں صور اسرافیل کا کام ۔۔۔ اور دس برس گزر جاتے ہیں تو ہندوستان کا وائسرائے اور ہندوستان کے

لکھ پتی سیٹھ اس کے ضمیر کی بے پناہ قوت کو پہچاننے لگتے ہیں۔ ایک ربع صدی کے بعد اقبال نے بندۂ مومن کے بیان میں جو شعر کہے، وہ گویا محمد علی جناح کی سیرت کے بیان میں ہیں:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو بزم ہو پاک دل و پاکباز

جب پاکستان کے لیے قائدِ اعظم کی جنگ کے دس سال شروع ہوئے تو کئی ایسے مرحلے بھی آئے کہ اچھے اچھوں کا زہرہ آب ہو گیا۔ مگر مایوسی کا لفظ قائدِ اعظم کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے پہلے استقلال سے منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتے چلے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ قائدِ اعظم نے یہ لڑائی بڑی تلخی سے لڑی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تلخی کی لَے دوسری طرف سے بڑھائی گئی۔ اور دوسری طرف ہندو تو تھے ہی مگر بدقسمتی سے جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، کچھ مسلمان بھی تھے۔ کئی موقعوں پہ قائدِ اعظم نے مخالفین کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھایا کہ جھگڑا شاید بغیر بدمزگی کے طے ہو جائے۔ قائدِ اعظم کی اس قسم کی کوششوں میں سے ایک کی کیفیت، جس کا میں چشم دید گواہ ہوں، ابھی آپ کو سناؤں گا۔ خیر سگالی کی ان کوششوں کے باوجود نتیجہ وہی نکلا جو دنیا پہ ظاہر ہے۔ ہندو اخبارات کے کارٹونوں نے اور غلط رنگ میں ایجاد کی ہوئی خبروں نے روزِ اوّل سے ایک طوفان برپا کر دیا۔ مخالف لیڈروں نے طنز، تضحیک، توہین، بلکہ سبّ و شتم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ ایک شخص لاہور سے اٹھا، بمبئی پہنچا، اور چھرا لے کر قائدِ اعظم پہ حملہ آور ہوا۔ اس دورِ ابتلا میں قائدِ اعظم کا اطمینانِ خاطر حیرت انگیز طور پہ برقرار رہا۔ ان کی آواز میں بجلی کی کڑک بھی تھی لیکن ان دنوں عام جلسوں میں اپنے مخالفین کے سامنے نظریۂ پاکستان پیش کرتے ہوئے ان کے لہجے میں کئی بار عجیب و غریب ملائمت ہوتی۔ میں ستائیس برس پہلے کا ایک نظارہ، جو اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔

۴۴-۱۹۴۳ء کا تعلیمی سال شروع ہوئے کچھ مدت گزر چکی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے یونیورسٹی یونین کے انتخابات میں پہلی بار ایسی کامیابی حاصل کی کہ یونین پہ گویا ان کا

قبضہ ہوگیا۔ اُن کی یہ درخواست کہ قائدِ اعظم تشریف لائیں اور یونیورسٹی ہال پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرائیں، قائدِ اعظم نے منظور نہ کی، کیونکہ قائدِ اعظم کی رائے میں یہ حرکت اپنی فتح مندی کی ایسی نمائش ہوتی جس سے یونیورسٹی کے ہندو طلبا کو ناحق تکلیف ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ قائدِ اعظم نے یونین کے زیرِ اہتمام ایک جلسے میں تقریر کرنا منظور فرمایا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے مینارڈ ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں غیر مسلم طلبا کی خاصی بڑی تعداد شامل ہوئی۔ قائدِ اعظم کی تقریر جنگ جویانہ نہیں، صلح جویانہ تھی۔ ان کا خطاب خاص طور پر اپنے غیر مسلم سامعین سے تھا۔ وہ انھیں سمجھاتے رہے کہ نظریۂ پاکستان مسلمان قوم کو زندگی کے بنیادی حقوق دلانے کی کوشش کا نام ہے۔ اس سے ہندوؤں کے ساتھ دشمنی کو نا مقصود نہیں ہے۔ آخر میں قائدِ اعظم نے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر معاملہ صلح صفائی سے طے ہوگیا تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ مسلمان بالآخر ہندوؤں سے گہرے دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ یہاں پہنچ کر قائدِ اعظم نے اپنے ہندو سامعین کو ناگہاں خون کے رشتے کا واسطہ دیا اور آوازِ بلند کرکے اپنی تقریر اس جملے پر ختم کردی حضرات! یاد رکھیے کہ لہو کا جوش خود بخود اپنے بیگانے میں تمیز کرنا سکھا دیتا ہے۔

قائدِ اعظم کی تقریر انگریزی میں تھی اور اس کا آخری جملہ یہ تھا:

For, Gentlemen, remember that blood is thicker than water!

اسی زمانے کی ایک اور تقریر اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس تقریر سے جہاں قائدِ اعظم کے لازوال عزم و ایمان کا اظہار ہوتا ہے، وہاں اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ قائدِ اعظم خود اپنے قول و فعل پر کیسی نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنی زبان سے کوئی ایسا وعدہ، کوئی ایسا اعلان، کوئی ایسی دھمکی نہ نکالتے تھے جس پر پورا اترنا انھیں بعد میں ممکن دکھائی نہ دیتا ہو۔ یہ دوسری تقریر بھی جس کا ذکر اب مقصود ہے، لاہور کی ایک تقریر ہے۔ مگر اس مرتبہ ان کے سامعین پرانے اسلامیہ کالج کے میدان میں جمع ہوئے۔ یہ میدان شہر کے مسلمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس دور میں اندیشہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ انگریزی حکومت (جو پاکستان کے تصوّر کو قبول کرنے سے مسلسل ہچکچا رہی تھی) کہیں یہ نہ کرے کہ مسلم لیگ سے بالا بالا ہندو کانگریس سے سمجھوتہ کرلے۔ قائدِ اعظم نے بڑی تفصیل سے اس صورتِ حال کی شرح کی اور انگریزی حکومت کی تنبیہ کے لیے اعلان کیا کہ مسلمانوں

کو نظر انداز کر کے ہندوؤں سے الگ سوداگھاٹے کا سودا رہے گا۔ یہاں پہنچ کر قائدِ اعظم نے لفظوں کے محتاط استعمال کی انتہا کر دی۔ ان کی آواز میں شیر کی گرج تھی مگر دماغ کا محتسب انتخاب الفاظ کے لیے دامنگیر تھا — "اگر برطانوی حکومت نے اس طرح کیا . . . . " اور اس جگہ قائدِ اعظم رُک گئے، اور تین بار رُکے، کیونکہ انھیں کسی ایسے موزوں لفظ کی تلاش تھی جو عملی امکانات کی روشنی میں مسلم لیگ کی ذمہ داریوں کے مطابق ہو اور ساتھ ہی اتنا زور دار بھی ہو کہ انگریزی حکومت کو مسلمانوں کے خلاف کوئی غلط روش اختیار کرنے سے باز رکھے۔ اب اس موقع پر قائدِ اعظم کی احتیاط ملاحظہ کیجیے:

"اگر برطانوی حکومت نے اس طرح کیا، تو ہم — تو ہم — مقابلہ کریں گے"۔

اصل تقریر یہاں بھی انگریزی میں تھی اور قائدِ اعظم کے اپنے الفاظ یہ تھے:

If The British Government does this we will — we will — we will resist!

جن لوگوں نے قائدِ اعظم کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے، وہ اپنے اپنے تجربات میں ان کی انسانی عظمت کی داستان سناتے ہیں مگر سبھی مانتے ہیں کہ قائدِ اعظم کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ضعف و یاس کے تاریک ترین لمحات میں بھی انھوں نے قوم کے ضمیر میں ایمان کی چنگاری اور قوم کے دل میں امید کی کرن روشن رکھی۔ پاکستان کے جشنِ آزادی کی پہلی سالگرہ پر اگست ۱۹۴۸ء میں انھوں نے قوم کے نام اپنا آخری پیغام بھیجا اور فرمایا:

"قدرت نے آپ کو سبھی کچھ دیا ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں لامحدود وسائل ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھی جا چکی ہیں۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ عمارت کو تیار کر دیں اور جس قدر تیزی سے جس قدر خوبی سے ممکن ہو تیار کر دیں"۔